آغا ناصر

خواجہ معین الدین

خواجہ معین الدین سے میری ملاقات سب سے پہلے کب اور کہاں ہوئی یہ تو اب مجھے یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ جب ہم رسمی طور پر ملے تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ خواجہ معین الدین کی ذات تو کراچی میں رہنے والوں کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر میں بھی ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایک بار رسمی طور پر متعارف ہو گئے تو بس پھر ملتے ہی چلے گئے اور دو چار ملاقاتوں میں قربت اور محبت کے ان درجوں میں پہنچ گئے جہاں پہنچنے کے لیے عام حالات میں دو چار برسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بے تکلفی اور قربت کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہمارے درمیان کسی "کام" "یا" غرض کا رشتہ نہیں تھا۔ یہ تعلقات جو بہت جلد دوستی کی صورت اختیار کر گئے "مبنی" خلوص اور بے غرضی پر مبنی تھے۔ دوسرے ایک قدر مشترک جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بے حد قریب کر دیا وہ ڈرامہ سے ہمارا لگاؤ اور اس فن سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔

یہ ۱۹۵۰ء کے عشرے کا آخری زمانہ تھا۔ میں نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں ملازمت کر لی تھی اور ڈرامہ سیکشن کا انچارج تھا۔ ریڈیو پاکستان کراچی پر ان دنوں حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے دوستوں کا راج تھا۔ مرزا ظفر الحسن' محمد عمر مہاجر' مجید فاروقی' وراثت مرزا' عبدالماجد احمد رشدی' بدر رضوان' احمد عبدالقیوم' عنایت علی شاعر' انور عنایت اللہ' نشریات کی دنیا کے آسمان کے ان ستاروں سی کہکشاں کراچی کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی آغوش میں اتر آئی تھی۔ یہ سب خواجہ معین الدین کے پرانے شناسا تھے۔ ان میں سے بہت سے ان کے نیاز مند تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کے خواجہ معین الدین نیاز مند تھے۔

اس زمانہ کا ریڈیو پاکستان آج سے بہت مختلف تھا۔ در اصل نشریات تو دو تین گھنٹے صبح کے اوقات میں اور پانچ چھ گھنٹے رات کو ہوتی تھیں مگر ریڈیو اسٹیشن پر سارے دن گہما گہمی رہتی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ بندر روڈ پر واقع ریڈیو پاکستان کا براڈ کاسٹنگ ہاؤس کراچی شہر کا سب سے بڑا ادبی اور ثقافتی مرکز تھا تو غلط نہ ہو گا۔ شہر کے سارے دانشور' مشہور شاعر' نامور ادیب' مقبول گلوکار اور اداکار' معروف صحافی غرض ادب' آرٹ' موسیقی مصوری کے شعبوں سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی اہم شخصیت ایسی نہ تھی جو اگر روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتے میں ایک دو بار کراچی ریڈیو اسٹیشن کا چکر نہ لگائے۔ خواجہ معین الدین کا بھی یہی طریقہ تھا۔ انہیں جب فرصت ملتی سیدھے ریڈیو اسٹیشن آتے' احباب سے ملتے' ادبی' ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر ہونے والے تبصروں اور بحثوں میں حصہ لیتے' گپ لگاتے اور چلے جاتے۔ نہ انہیں کسی سے کوئی ذاتی کام ہوتا تھا نہ وہ ریڈیو کے کسی پروگرام میں حصہ لیتے تھے' نہ ریڈیو کے لیے کچھ لکھتے تھے۔ ریڈیو

اسٹیشن پر ان کی آمد محض دوستوں سے ملاقات کی غرض سے ہوتی تھی۔ اور میں اس بات پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں کہ دوستوں کے اس حلقہ میں میں بھی شامل تھا بلکہ میرا نام ان دوستوں کی ترجیحات کی فہرست میں بہت اونچا تھا۔ وہ مجھے آغا خان کہہ کر پکارتے تھے اور میں جواب میں انہیں معین خان کہتا تھا۔

ہماری ملاقاتوں نے کچھ عرصہ بعد ایک اور طرح کے تعلقات کو جنم دیا جو پیشہ ورانہ نوعیت کے تھے۔

ایک دن معین خان نے مجھ سے کہا کہ ملک میں ڈرامہ کے فروغ اور مستحکم بنیادوں پر اسٹیج کے قیام کے لیے بہت سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر نہیں کی جا سکتیں۔ لہذا کیوں نہ ہم ایک ایسی انجمن قائم کریں جو اسٹیج سے منسلک ادیبوں' ہدایت کاروں اور دوسرے کارکنوں کی انجمن ہو۔ کچھ دن غور و خوض کے بعد اور دوسرے دوستوں سے مشورے کے ساتھ ہم نے "ڈرامہ گلڈ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے پہلے صدر خواجہ معین الدین اور سیکرٹری میں تھا۔ ڈرامہ گلڈ کو پہلے ہی دن ڈراموں کا ایک بڑا خزانہ ہاتھ آگیا جو ہم نے گلڈ کے بینر کے تحت اسٹیج کرنا شروع کیے۔ یہ ڈرامے خواجہ معین الدین کے ڈرامے تھے جو گذشتہ دس بارہ برسوں میں بے حد شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ملک کے مختلف شہروں میں جہاں جہاں بھی یہ ڈرامے اسٹیج کئے گئے' بے حد مقبول ہوئے اور یوں ڈرامہ گلڈ نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا جس کے لیے یہ قائم کیا گیا تھا۔

خواجہ معین الدین بلا شبہ اردو کے عظیم ڈرامہ نگار تھے۔ وہ صرف ڈرامہ لکھتے ہی نہیں تھے۔ ڈرامے کرتے بھی تھے۔ جو لوگ ڈرامہ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ڈرامہ کاغذ کے صفحات کے لیے نہیں ہوتا اسٹیج پر پیش کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ پیشکش ہدایت کار' تزئین کار' اداکاروں اور دوسرے کارکنوں کی اجتماعی کاوشوں سے وجود میں آتی ہے۔ خواجہ معین الدین کو یہ فن آتا تھا۔ وہ ڈرامہ لکھتے تھے' اس کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیتے تھے اس کے سیٹ ڈیزائن میں رہنمائی کرتے تھے اور اپنی ڈرامہ ٹیم کے پروڈکشن مینیجر یعنی منتظم اعلی کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے۔ چونکہ وہ ان سارے مرحلوں اور تمام مشکلوں سے آگاہ تھے جو ڈرامہ کرنے والوں کو پیش آتی ہیں اس لیے وہ اسکرپٹ لکھتے وقت ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے تھے۔

بحیثیت ہدایت کار خواجہ معین الدین اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جو اداکاروں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا قائل ہے۔ اداکاروں کے انتخاب میں وہ نہایت محتاط تھے اور بڑے سوچ بچار کے بعد کردار کی مناسبت سے اداکار منتخب کرتے تھے۔ مگر جب ایک بار کوئی رول کسی کو دے دیتے تھے تو پھر اس کی ادائیگی میں بڑی حد تک اسے خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ وہ خود کر کے دکھانے والے ہدایت کار نہیں تھے بلکہ گفتگو کے ذریعہ اداکار کو اس کا کردار سمجھاتے تھے اور اس موقع پر باہمی صلاح مشورے کے اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر ان کی ٹیم کا کوئی رکن مناسب مشورہ دے تو اسے قبول کر لیتے تھے۔ اس طرح وہ نہ صرف اداکار کو اس کے کردار کی اصل روح سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد دیتے تھے بلکہ خود بھی اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے تھے کہ انہوں نے جو کردار تشکیل کیا ہے دوسروں نے اسے کس طرح سمجھا ہے۔ ریہرسلوں کے دوران حصہ لینے والوں کو اظہار خیال کی مکمل آزادی ہوتی تھی اور اس طرح کرداروں کی تراش خراش اور وضع قطع میں اگر کمزوریاں موجود ہوں تو انہیں دور کر دیا جاتا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہر کسی کو کھلی چھٹی تھی کہ جو چاہے کرے۔ Discipline کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر

تھے۔ باہمی صلاح مشورے کے بعد جو باتیں طے ہو جاتیں اس پر سختی سے عمل کرتے اور پھر کسی کو کسی قسم کے رد و بدل کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

خواجہ معین الدین ایک Practical انسان تھے اس لیے ان کے پیش نظر نہ صرف اپنے ناظرین کے ذوق اور پسند کا خیال ہوتا تھا بلکہ ڈرامہ کی پیشکش میں حائل عملی دشواریاں بھی۔ مثال کے طور پر ان کے ڈراموں میں آپ کو عورتوں کے کردار کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب انہوں نے یہ ڈرامے تخلیق کئے پاکستان میں خواتین کے اسٹیج پر کام کرنے کا رواج نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے ڈراموں میں نسوانی کردار سرے سے رکھے ہی نہیں اور داد دینی پڑتی ہے کہ یہ کام اس خوبصورتی اور مہارت سے کیا کہ دیکھنے والوں کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

بحیثیت ایک ہدایت کار کے انہیں ان تمام مسائل کا بھی بخوبی علم تھا جو اسٹیج پر سیٹ لگانے اور اس کی تزئین سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے تحریر کردہ ڈراموں میں بالالتزام ایسے سیٹ لگائے جاتے تھے جو آسانی سے تبدیل ہو سکیں اور ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے ساتھ لے جائے جا سکیں۔

ایک منتظم کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ٹیم کے لیے جو مثال قائم کی وہ قابل تحسین ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ مصنف، ہدایت کار اور منتظم اعلیٰ ہونے کے باوجود خود کو اس ٹیم کا ایک عام رکن سمجھتے تھے اور کسی قسم کا ترجیحی برتاؤ یا طریقہ اپنے لیے قبول نہ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ۶۶-۱۹۶۵ء میں جب میں لاہور میں نئے آغاز ہونے والے ٹیلی ویژن اسٹیشن سے منسلک تھا۔ خواجہ معین الدین اپنی ٹیم کے ساتھ لاہور کی آرٹ کونسل میں ڈرامہ اسٹیج کرنے کراچی سے آئے۔ ان کے ساتھ دس بارہ اداکاروں اور ڈرامے کے کارکنوں کی ٹیم تھی۔ انہوں نے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے آرٹ کونسل کی عمارت کے ایک بڑے ہال میں ٹھہرنا پسند کیا۔ چونکہ اس میں پیسوں کی بچت تھی اور وہ کم سے کم خرچ سے ڈرامہ کرنے کے قائل تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر سکیں۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں شام کو ملنے کے لیے آرٹ کونسل پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں اس ہال میں گیا جہاں ڈرامہ گلڈ کی ٹیم قیام پذیر تھی۔ میں نے دیکھا، زمین پر برابر دس بارہ بستر لگے ہوئے ہیں اور میرے سارے جانے پہچانے دوست، کمبل اور لحافوں میں لپٹے لاہور کی سردی سے نبرد آزما ہیں۔ سب سے پہلا فرشی بستر خواجہ معین الدین کا تھا۔ میں نے انہیں ساتھ لے جانا چاہا لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔ ان کا موقف تھا جہاں میری ٹیم کے باقی افراد رہیں گے وہیں میں بھی رہوں گا۔ خود ان کے ساتھیوں نے مجھے کہا کہ آپ خواجہ صاحب کو اپنے گھر لے جائیں۔ ہماری یہی خواہش ہے مگر خواجہ صاحب ایسی باتیں ماننے والے کہاں تھے۔

ڈرامہ ان کا Passion تھا۔ وہ نہ صرف اپنی تحریر کے ذریعہ بلکہ عملی طور پر بھی ایسا کچھ کرنا چاہتے تھے جس سے ڈرامہ اور ڈرامہ کے فن سے وابستہ فنکاروں کا وقار بلند ہو۔ انہوں نے اس ضمن میں چند اصول وضع کیے ہوئے تھے اور بڑی سختی سے ان پر عمل کرتے تھے مثلاً مجھے یاد ہے ایک بار میں اور وہ ایک سرکاری ادارے سے ڈرامہ اسٹیج کرنے کے لیے کچھ رقم حاصل کرنے ایک بڑے افسر سے ملنے جب ہم مالی تعاون کی گفتگو ختم کر چکے تو اٹھ کر چلنے سے پہلے خواجہ معین الدین نے اس افسر سے کہا اور صاحب ایک بات اور نوٹ کر لیجئے۔ آپ نے مالی امداد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے ہم شکرگزار ہیں مگر جب ڈرامہ اسٹیج ہو تو ہم سے مفت پاس نہ مانگئے گا۔ خواجہ معین الدین اس بات کے سخت خلاف تھے کہ ڈرامہ

مفت میں دیکھا جائے۔ ایک کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں ڈرامہ سٹیج کر رہے تھے۔ شام سے کچھ پہلے خواجہ معین نے جیب سے بہت سے کرنسی نوٹ نکالے اور اپنے کسی ساتھی کو دیتے ہوئے کہا کہ اس ڈرامے کے دس ٹکٹ خرید لاؤ۔ میں نے پوچھا معین خان کس لئے؟ کہنے لگے "ڈپٹی کمشنر اور انکم ٹیکس کے دفتر والوں کی طرف سے ڈرامہ دیکھنے کے لیے سخت دباؤ ہے اب ظاہر ہے ٹکٹ وہ خریدنے کے عادی نہیں۔ مفت ڈرامہ دکھانے کا میں قائل نہیں ہوں بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ان کے لئے میں اپنی جیب سے ٹکٹ خریدوں۔" یہ ان کی اصول پسندی تھی ورنہ ڈرامہ کا مصنف' اس کا ہدایت کار اور ڈرامہ گلڈ کا صدر۔۔۔ کیا اپنی کسی حیثیت میں بھی چند لوگوں کو مفت ڈرامہ دکھانے کا مجاز نہیں تھا۔

خواجہ معین الدین نے پاکستان آنے کے بعد ابتدائی پانچ چھ برسوں میں پانچ چھ ڈرامے لکھ ڈالے۔ آج تیس چالیس برس گزر جانے کے باوجود بھی ان سارے ڈراموں میں تازگی اور کشش باقی ہے۔ ان کے تحریر کردہ ڈراموں کا ایک منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ایسے موضوعات پر ہیں جو قومی اور سیاسی نوعیت کے ہیں۔ ہر ڈرامہ کا کوئی مقصد ہے اور ہر ڈرامے میں کوئی پیغام ہے۔ "زوال حیدر آباد" ہندوستان کی ایک بڑی مسلم ریاست پر بھارتی سامراج کے ظلم و تشدد کی کہانی ہے۔ "لال قلعے سے لالو کھیت" ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے لاکھوں مہاجرین اور پاکستان کے ابتدائی زمانے کی صورتحال کا تجزیہ ہے۔ "مرزا غالب بندر روڈ پر" پاکستان کے اس وقت کے دارالحکومت کراچی کی معاشرتی زندگی کا عکس ہے "وادی کشمیر" کشمیر کے مجبور و لاچار شہریوں کی داستان ہے اور "تعلیم بالغاں" قومی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا مرقع ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا۔ خواجہ معین الدین نے جس موضوع کا بھی انتخاب کیا اس کا تعلق ہماری قومی زندگی سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ معین الدین ایک پکا مسلمان' سچا پاکستانی اور انتہا درجے کا انسان دوست آدمی تھا۔ قوم کو اجتماعی مشکلات اور مسائل میں گھرا دیکھ کر اس کا دل روتا تھا اور لوگوں کی انفرادی مصیبتوں اور دکھوں سے اس کا سکون اڑ جاتا تھا۔ اسی لیے اس نے جب بھی قلم اٹھایا ہمیشہ ہی ایسے موضوعات پر لکھا۔ خواجہ معین نے اپنی بات کہنے کے لیے طنز کے پیرائے کو منتخب کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو بات مسکراہٹوں اور قہقہوں کے ریشم میں لپٹ کر کہی جائے۔ اس کی چبھن کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے خواجہ معین کو طنز و مزاح کی ایسی صلاحیت عطا کی تھی کہ اس کا استعمال نہ کرنا کفران نعمت ہوتا۔ ان کے فقروں کی کاٹ اور ان کے طنزیہ جملوں کی تراش خراش ایسی ہوتی تھی کہ انسان سن کر درد سے تڑپ اٹھتا تھا۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رہتی تھی۔ خواجہ معین بے حد حساس انسان تھے۔ وہ اس نوزائیدہ مملکت سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے اور اسی لئے جب معاشرے میں پھیلتی ہوئی خرابیوں اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کو محسوس کرتے تو تلملا اٹھتے تھے یا جب روز بروز بڑھتے ہوئے سیاسی انتشار اور منافقت کی گرمبازاری کو دیکھتے تو دل پر پر ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرتے تھے ان کی یہ کیفیت ان کے تمام ڈراموں میں صاف نظر آتی ہے۔

ایک بڑے تخلیق کار کی طرح خواجہ معین کو مستقبل میں دیکھنے کا وصف بھی حاصل تھا۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جو کچھ لکھا اور جن آنے والے حالات کی نشاندہی کی وہ آج ہمیں درپیش ہیں۔ اپنے ڈرامے "تعلیم بالغاں" میں آج سے ۳۵ برس پہلے انہوں نے شاگردوں کو "اسلحہ" لے کر کلاس اٹینڈ کرائی اور "چھری اور قینچی" کے زور پر اپنی بات منوانے کا منظر پیش کیا۔ کیا اس زمانے میں کوئی تصور کر سکتا تھا کہ

تیس پینتیس سال بعد ہمارے تعلیمی اداروں کا یہی کلچر ہو گا؟ اسی طرح ڈرامہ میں انہوں نے نسلی اور علاقائی تعصب کے عفریت سے بچنے کی تنبیہہ کی تھی جو پچیس سال بعد کراچی کے گلی کوچوں میں سرعام ناچتا ہوا نظر آیا۔ یہ باتیں قوم کا درد رکھنے والا ایک ایسا حساس انسان ہی لکھ سکتا ہے جس کو اللہ نے مستقبل میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کی ہو اور خواجہ معین الدین بے شک خدا کا وہ بندہ تھا جس میں یہ صلاحیت تھی۔ شاید مضمون طویل ہو گیا اور غالباً" بے ربط بھی۔ مگر میں بے بس ہوں جس آدمی کو آپ اتنا زیادہ جانتے ہوں اور جس کے بارے بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہو اس کا ذکر کم وقت میں اور تواتر اور ترتیب کے ساتھ کم از کم میرے لئے تو بہت مشکل ہے۔

میں نے مضمون کے آغاز میں کہا تھا کہ مجھے یاد نہیں خواجہ معین الدین سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے مجھے ان کا ملنا یاد نہیں ہے مگر ان کا بچھڑنا یاد ہے۔ ۱۹۷۱ء کے پر آشوب زمانے میں نومبر کی دس تاریخ کو جب میں راولپنڈی اسلام آباد ٹیلی وژن سینٹر میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کراچی سے کنور آفتاب احمد کا فون آیا اور اس نے بتایا "خواجہ معین الدین مر گئے"۔ دسمبر ۷۱ کی جنگ کے بعد جب میں کراچی گیا تو میرے اور خواجہ معین الدین کے ایک مشترک دوست نے مجھ سے کہا۔ "اچھا ہوا وہ مر گئے۔ دسمبر میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی خبر سن کر انہیں ویسے بھی مر جانا تھا"۔

■

Duplicate

Courtesy: Mrs Zahra Qadiri
London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمارہ ۱۸
جلد ۵
سرما ۱۹۹۲ء

مدیر مسئول : غلام ربانی آگرو

مدیر منتظم : افتخار عارف

سہ ماہی
ادبیات